نقطۂ تحقیق

"نظریہ مراعاۃ الخلاف"

عرفان خالد ڈھلوں، لیکچرر گورنمنٹ مرے کالج سیالکوٹ

عنوان "نقطۂ تحقیق" کے تحت ادارہ ایک ایسی رائے کو پیش کر رہا ہے جو عام متداول رائے سے ہٹ کر ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اپنے موقف کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اہل علم حضرات فاضل مقالہ نگار سے اتفاق نہ رکھتے ہوں اور اس مسئلہ پر کچھ تحریر کرنا چاہیں تو ادارہ ان کی مدلل رائے کو شائع کرنے میں خوشی محسوس کرے گا۔ (ادارہ)

نظریہ "مراعاۃ الخلاف" کا تعلق اسلام کے مختلف فقہی مذاہب کے مابین پائے جانے والے فقہی اختلافات سے ہے۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تمام مسائل جن میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے ان میں لوگوں کے لیے عمل میں تخفیف اور سہولت اور مفتی کے لیے فتویٰ دینے کی گنجائش موجود ہے۔ یہ نظریہ فقہی احکامات میں لوگوں کے لیے تخفیف اور سہولت کی جو جگہ پیدا کرتا ہے اس کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے۔

قرآن مجید شرعی اوامر و نواہی کے نفاذ میں تمام مکلفین سے یکساں مطالبہ نہیں کرتا۔ قرآن مجید کی رُو سے شرعی احکامات کے مطالبہ و نفاذ کے ضمن میں مکلفین کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ مکلفین کی پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو پختہ ایمان اور مضبوط جسم کے مالک ہیں۔ تمام شرعی

احکامات پر عمل کرنے میں ہر قسم کی سختی، تنگی اور آزمائش برداشت کر سکتے ہیں اور جو عزیمت کی راہ اختیار کرنے والے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے قرآن مجید یوں خطاب کرتا ہے:

یایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ[1]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

ایسے لوگ شرعی اوامر و نواہی کے مطالبات اور تقاضوں کو پورا کرتے وقت تخفیف اور رعایت سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔

۲۔ دوسری قسم ان مکلفین کی ہے جو ایمان و جسم کے اعتبار سے پہلی قسم کے مکلّفین کی طرح پختہ و مضبوط نہیں ہوتے۔ ان سے شرعی احکامات کے مطالبہ و نفاذ میں تخفیف برتی گئی ہے ایسے مکلّفین سے قرآن کے خطاب کا انداز یہ ہے:

فاتقوا اللہ ما استطعتم[2]

لہٰذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔

اسی طرح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی بھی ہے:

وما امرتکم بہ فافعلوا منہ ما استطعتم[3]

اور جس کام کے کرنے کا میں تمہیں حکم دوں اس پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرو۔

احکامِ شریعت پر عمل درآمد اسی حد تک مطلوب ہے جس حد تک ایک مکلّف میں اس کی استطاعت ہے۔ کوئی شخص اپنی استطاعت اور طاقت سے بڑھ کر کسی فعل کا مکلّف نہیں ہے۔

علامہ عبدالوہاب الشعرانی کہتے ہیں:

"فإن جميع المكلّفين لا يخرجون عن قسمين قوي وضعيف من حيث ايمانه وجسمه في كل عصر وزمان فمن قوي منهم خوطب بالتشديد والأخذ بالعزائم ومن ضعف منهم خوطب بالتخفيف والأخذ بالرخص وكل منهما على شريعة من ربه"[4]

ہر زمانے میں تمام مکلّفین ایمان و جسم کے اعتبار سے دو قسموں سے باہر نہیں ہیں۔ قوی

اور ضعیف قوی مکلّف سے شریعت کے خطاب میں سختی ہوگی اور اس سے عزیمت کی راہ اختیار کرنے کا مطالبہ ہوگا جبکہ ضعیف مکلّف سے شریعت کے خطاب میں تخفیف ہوگی اور اسے رخصتیں دی جائیں گی۔ ان دونوں قسموں کے مکلفین اپنے رب کی شریعت پر ہی عمل پیرا ہوں گے۔

شریعت نے احکامات کے نفاذ و مطالبہ کے سلسلہ میں جس طرح مکلّفین کی دو اقسام کی ہیں اسی طرح مکلفین کی حیثیتوں کو مدنظر رکھ کر شرعی احکامات کو بھی مختلف قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تمام احکامات ایک ہی قوت اور درجے میں نافذ ہوتے ہوں۔ ان میں سے بعض واجب ہیں، بعض مندوب، بعض مباح، بعض حرام اور بعض مکروہ ہیں۔ واجب اور حرام کے احکامات میں سختی پائی جاتی ہے۔ مندوب اور مکروہ کے احکامات میں نرمی ہے اور مباح احکامات میں شریعت اسلامی نے لوگوں کے ساتھ مزید نرمی اور سہولت سے کام لیا ہے جن میں انہیں عمل کرنے کے سلسلہ میں صوابدیدی اختیار دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی مطلق امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہاں وہ کسی چیز یا فعل کے صرف وجوب پر ہی دلالت نہیں کرتا بلکہ کوئی وجوب پر دلالت کرتا ہے، کوئی مندوب پر اور کوئی مباح پر دلالت کرتا ہے۔ فقہائے کرام اس ضمن میں اتفاق کرتے ہیں کہ مطلق امر کا صیغہ ان تینوں میں سے کسی ایک پر دلالت کرتا ہے۔

أن الأمر وضع في الأصل للدلالة على معنى واحدة من هذه المعاني الثلاثة [۵]

بنیادی طور پر مطلق امر کا صیغہ ان تین معانی میں سے کسی ایک معنی پر دلالت کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ ان تینوں معانی میں سے کون سا معنی مراد ہے اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے:

- بعض مالکیوں کی رائے یہ ہے کہ مطلق امر کا صیغہ اباحت پر دلالت کرتا ہے۔
- امام شافعیؒ کا ایک قول ہے کہ اس صیغہ سے مندوب کا معنی مراد لیا جائے گا۔
- جبکہ جمہور کی رائے یہ ہے:

"انه للوجوب ۔ أی ان الأمر المطلق وضع للدلالة على الوجوب فهو حقيقة فيه مجاز في غيره فلا يصار الى غير الوجوب الا بقرينة ۔[۵]"

مطلق امر کا صیغہ وجوب کیلیے ہے یعنی مطلق امر وجوب پر دلالت کرنے کے لیے وضع ہوا ہے ۔ اپنے حقیقی معنی میں وہ وجوب پر ہی دلالت کرے گا اس کے علاوہ کسی اور معنی میں مجازی طور پر دلالت کرے گا اور بغیر کسی قرینے کے اس سے وجوب کے علاوہ کوئی اور معنی نہیں لیا جائے گا۔

لہذا ایک چیز کا حکم ایک فقیہ کے نزدیک واجب ہو سکتا ہے جبکہ دوسرے کے نزدیک مندوب اور تیسرے کے نزدیک وہ حکم مباح ہو سکتا ہے ۔

شرعی اور فقہی احکام میں یہ تقسیم اور درجہ بندی اپنے اندر لوگوں کے لیے تخفیف اور سہولت رکھتی ہے ۔ جس طرح شرعی احکامات میں لوگوں کے لیے سہولت ہے اسی طرح فقہی معاملات میں فقہاء کرام کے مابین پائے جانے والے اختلافات میں لوگوں کے لیے عمل میں آسانی ہے ۔

فقہ اسلامی میں در اصل دو طرح کے مسائل پائے جاتے ہیں ۔

۱۔ **متفق علیها** : وہ مسائل جن پر فقہائے کرام کے مابین اتفاق ہو متفقہ مسئلہ کا صرف ایک ہی پہلو ہوتا ہے اور اس پر فقہائے کرام کا اتفاق ہوتا ہے لہذا اسے اختیار کرنا لازمی ہوتا ہے ۔

۲ ۔ **مختلف فيها** : مسائل کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے جن کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے ۔ جب اختلافی مسئلہ کو بھی لیا جائے اس میں اختلاف کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ایک سے زیادہ پہلو ہیں ۔ ہر پہلو دوسرے پہلو سے مختلف ہوتا ہے ۔ اختلافی مسائل میں عام طور پر ان پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کسی دوسرے پہلو کے مخالف قول کا اعتبار کر لیا گیا ہے ۔

نظریہ " **مراعاة الخلاف** " کا تعلق اختلافی فقہی مسائل سے ہے متفقہ سے نہیں ۔ متفقہ اور اختلافی فقہی مسائل کے درمیان ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اختلافی مسئلہ کی قوت متفقہ مسئلہ کی قوت سے ہمیشہ

کم ہوتی ہے۔ ایک ایسا مسئلہ جس پر تمام فقہا متفق ہوں اس کے مطالبہ ونفاذ کی قوت یقیناً اس مسئلہ سے زیادہ ہے جس کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلافی آراء پائی جاتی ہوں۔ لہٰذا اختلافی مسئلہ کو وہ حیثیت و مقام حاصل نہیں جو متفقہ مسئلہ کو حاصل ہے۔ اختلافی مسئلہ میں متعارض ومخالف اقوال میں سے ہر ایک قول اس مسئلہ کے جس پہلو کا مطالبہ وتقاضا کرتا ہے، دوسرا قول اس کے برعکس مطالبہ کر رہا ہوتا ہے۔ پس کسی ایک فریق کے قول کا اعتبار کرتے ہوئے اس اختلافی مسئلہ کے کسی ایک پہلو کو ترجیح دے دی جاتی ہے اور اس پہلو کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔ یہی چیز اس مسئلہ کی اہمیت وشدت کو ایک متفقہ مسئلہ کے مقابلے میں کم کر دیتی ہے۔ لہٰذا مطالبہ ونفاذ میں جو شدت متفقہ مسائل میں برتی جاتی ہے ویسی شدت اختلافی مسائل میں اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اختلافی مسائل میں پائی جانے والی اس کمزوری سے نظریہ "**مراعاۃ الخلاف**" جنم لیتا ہے۔ جس کی رُو سے لوگوں کو اختلافی مسائل پر عمل کرنے میں تخفیف وسہولت میسر آجاتی ہے اور کسی ایسے قول کو اختیار کر لیا جاتا ہے جس پر عمل کرنے سے آسانی ہو اور دشواری ختم ہو۔

جس طرح ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم انبیاء کرام رضوان اللہ اجمعین اور انکی شریعتوں پر کوئی اعتراض کریں باوجودیکہ ان کی شریعتیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی درست نہیں ہے کہ اسلام کے مختلف فقہی مذاہب کے آئمہ کرام نے اجتہادات کے ذریعے جن احکامات کا استنباط کیا ہے اور جو فقہی آراء قائم کی ہیں اُن پر کوئی اعتراض کریں جب تک کہ وہ قرآن وسنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منافی نہ ہوں۔ ہر مجتہد اپنے تئیں کوشش کر کے قرآن وسنت کی روشنی میں کسی فقہی مسئلہ کے بارے میں اجتہادی رائے دیتا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مجتہد کو اجر وثواب کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ اگر اس کی اجتہادی رائے میں کوئی خطا پائی گئی تب بھی وہ اجر سے محروم نہیں رہے گا۔

حضرت عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اذا حکم الحکم فاجتھد ثم اصاب فلہ اجران و اذا حکم الحاکم فاجتھد ثم اخطأ فلہ اجر"

جب حاکم کسی بات کا فیصلہ کرے اور اس میں اجتہاد سے کام لے اور وہ صحیح

ہو تو اس کے لیے دگنا ثواب ہے اور اگر وہ حکم دے اور اس میں اجتہاد سے کام لے اور وہ غلط ہو تو اس کو ایک ثواب ملے گا۔

علامہ ابن حزم مندرجہ بالا حدیث میں مذکور مجتہد کی خطا کے بارے میں کہتے ہیں:

"أن المراد بالخطأ هنا عدم مصادفة الدليل كما تقدم لا الخطأ الذي يخرج صاحبه عن الشريعة اذ لو خرج به عن الشريعة لم يحصل له به اجر"

یہاں خطا سے مراد ایسی خطا ہے جو دلیل تک نہ پہنچ سکنے میں ہے یہ ایسی خطا نہیں ہے جو مجتہد کو شریعت سے خارج کر دے کیونکہ اگر اس خطا سے اس کا شریعت سے خارج ہونا ممکن ہوتا تو اس کو ایسے اجتہاد سے ایک اجر نہ ملتا۔

لہٰذا ایک شخص جسے خانہ کعبہ کی صحیح سمت معلوم نہیں ہے اپنے اجتہاد سے چار مختلف سمتوں میں ادا کرتا ہے تو اگرچہ ان چار سمتوں میں سے تین سمتیں یقینی طور پر قبلہ کی نہیں ہیں لیکن اس شخص کی نماز ہو جائے گی کیونکہ اس کی ہر رکعت کی ادائیگی اس کے اجتہاد پر مبنی ہے۔ اسی طرح کسی امام کی اجتہادی فقہی رائے کو غلط اور باطل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

نظریہ "مراعاۃ الخلاف" ہر فقہی مذہب کو اسی اندازِ نظر سے دیکھتا ہے۔ فرض کیا کہ کوئی چیز ایک فقہ میں جائز ہے جبکہ دوسری فقہ میں اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے اب اگر ایک شخص اس چیز کو جائز سمجھتے ہوئے اس پر عمل کرتا ہے تو وہ کسی امام کی اجتہادی رائے کو ہی اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے اس کے عمل کو باطل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ امام ابوحنیفہؒ کا نہ سہی امام مالکؒ کا اس کے جواز پر فتویٰ تو موجود ہے، امام شافعیؒ کا نہ سہی امام احمد بن حنبلؒ کا تو اس پر عمل ثابت ہے۔ اور جن فقہاء سے اس چیز کے جواز کا فتویٰ یا عمل ثابت ہے وہ اس شخص سے یقیناً بہتر لوگ تھے۔ یہ وہ احساس ہے جو ایک شخص میں فقہی اختلافات سے رعایت حاصل کرنے کی جرأت پیدا کرتا ہے اور کسی مذہب کی فقہی وسعتوں اور اس کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش نکالتا ہے۔

ایک شخص نفل نماز ادا کرتے ہوئے دو رکعت مکمل کرنے کے بعد سلام پھیرنے کی بجائے

ــــ بقول کہ تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ نفل نماز کی رکعتوں کی تعداد کے بارے میں فقہاء کرام کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے ۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک نفل نماز کی رکعتیں دو ہیں جبکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ چار یا چھ بھی ہو سکتی ہیں اگر نماز پڑھنے والا ان کے درمیان سلام نہ کرے[۱۵] اب اگر یہ شخص چار رکعت مکمل کرنے کے بعد سجدہ سہو کر کے سلام پھیر لیتا ہے تو وہ لوگ جو نفل نماز کو صرف دو رکعت میں ہی ادا کرنے کے قائل ہیں ۔ اسکی نماز باطل قرار نہیں دے سکتے کیونکہ اس نے جو عمل کیا ہے وہ دوسرے مذہب کے امام کے نزدیک درست بھی ہے ۔ یوں نظریہ "**مراعاة الخلاف**" کے تحت اس شخص کی نماز خراب ہونے سے بچ گئی ۔

یہ نظریہ فقہی اختلافات میں لوگوں کے لیے سہولت کی گنجائش نکالتا ہے لیکن جو شخص احکامات پر عمل کرنے میں عزیمت کی راہ اختیار کرنے کی قدرت رکھتا ہو اس کے لیے سہولتیں اور رخصتیں ڈھونڈنا درست نہیں ہے البتہ جو شخص کسی عذر کے تحت اپنے اندر کوئی ضعف اور کمزوری پائے تو وہ اپنے عجز کی وجہ سے اس بات کا مکلف نہیں ہے کہ وہ عزیمت اور سختی کا راستہ اختیار کرے بلکہ وہ شرعی اور فقہی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔ اور عجز کا بہانہ بنا کر حکم کو جس پر عمل کرنے کا اس سے مطالبہ کیا گیا ہے بالکل ترک نہیں کر سکتا ۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص کو وضو کے لیے پانی میسر نہیں لیکن اسے پاک مٹی دستیاب ہے تو وہ مٹی سے تیمم کر کے نماز ادا کرے گا اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ تیمم بھی ترک کر دے بلکہ وہ تیمم کی شرعی رخصت سے فائدہ اٹھائے گا ۔

تیمم کے بارے میں قرآن مجید کی آیت درج ذیل ہے :

"فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبا"[۱۶]

پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو ۔

فقہاء کرام درج بالا آیت میں مذکور لفظ "**صعیدًا**" کے معنی و مراد میں اختلافی آراء رکھتے ہیں جو درج ذیل ہیں[۱۷]

امام شافعی کی رائے ہے کہ خالص مٹی کے علاوہ کسی اور چیز سے تیمم جائز نہیں ہے ۔

امام احمد بن حنبل پاک گرد و غبار سے بھی تیمم کرنا جائز قرار دیتے ہیں۔
امام مالک کا یہ موقف ہے کہ ہر اس چیز سے تیمم جائز ہے جو وجہ الارض یعنی سطح زمین پر ہو۔
جبکہ امام ابوحنیفہؒ نے امام مالک سے بھی وسیع موقف اختیار کیا ہے ان کے نزدیک ہر اس چیز سے تیمم کرنا جائز اور درست ہے جو زمین سے متولد ہوئی ہو۔ مثلاً پتھر وغیرہ جس پر کوئی مٹی یا غبار نہیں ہوتا۔ کیونکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک 'صعید' سے مراد زمین ہے لہٰذا زمین کے تمام اجزا سے تیمم کرنا درست ہے۔
اب ایک شخص کسی جگہ یا عمارت میں مقیم ہے جو بالکل پختہ ہے۔ مٹی کا نام و نشان نہیں۔ صفائی اس قدر ہے کہ چاہتا ہے کہ گرد و غبار بھی نظر نہیں آتا۔ وہ پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے تیمم کرنا چاہتا ہے۔ وہ جس فقہی مسلک کا پیروکار ہے اس میں صرف خالص مٹی سے تیمم درست ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں اگر وہ یہ موقف اختیار کرتا ہے کہ چونکہ اس وقت اُسے خالص مٹی دستیاب نہیں اور اس کے فقہی مذہب میں خالص مٹی کے علاوہ کسی اور چیز سے تیمم کرنا درست نہیں کر سکتا۔ اپنے مذہب کی اس قدر غیر لچکدار تقلید کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نماز فوت کر دے گا۔ اس کا یہ موقف درست نہیں۔ اپنی نماز کو بچانے کے لیے اسے چاہیے کہ وہ ان حالات میں فقہی اختلافات سے حاصل ہونے والی مراعات سے فائدہ اٹھائے۔ وہ امام ابوحنیفہؒ کے فقہی موقف پر عمل کرتے ہوئے فرش یا دیوار وغیرہ کہیں سے بھی تیمم کرے خواہ وہاں گرد و غبار وغیرہ نہ ہو۔
اگر اس مسئلہ میں فقہاء کرام کی اختلافی آراء نہ ہوتیں اور تیمم کے لیے صرف خالص مٹی ہی لازم ہوتی تو اس سے عمل کرنے میں سخت دشواری ہوتی۔ لیکن نظریہ "مراعاۃ الخلاف" کی رو سے آسان رائے پر عمل کر لینے سے دشواری دور ہو گئی۔
اس نظریہ کے تحت آئمہ کرام کے جن اختلافات سے رعایت اور تخفیف کی گنجائش نکالی جاتی ہے وہ اختلافات شریعت کے اصولوں میں نہیں بلکہ فروعی ہیں۔ شریعت کے اصولوں پر تو سب کا اتفاق ہے۔ دین کے اصولوں میں اختلافات قطعی حرام ہے۔
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
"شرع لکم من الدین ما وصّٰی به نوحا والذی اوحینا الیك

وما وصینا به ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ أن اقیموا الدّین ولاتتفرقوا فیہ ؂۱۳"

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ اس دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

مختلف مسائل میں فقہاء کرام کا جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ دراصل پہلوؤں، سمتوں اور جہتوں کا ہے۔ ان فقہی اختلافات کی وجہ سے ایک ہی شریعت کی مختلف سمتیں اور جہتیں روشن ہو گئی ہیں جس کے باعث شریعتِ اسلامی کو اس عظیم الشان پھل آور درخت کی مانند قرار دیا جا سکتا ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں اور ہر سمت میں ہیں تاکہ کوئی شخص جدھر سے بھی آئے اس کے پھل سے لطف اندوز ہو سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس درخت کی صرف ایک ہی شاخ ہو اور ہر جانب سے آنے والے کو لازمی طور پر ایک ہی سمت سے راستہ اختیار کرتے ہوئے اس تک پہنچ کر اس کا پھل کھانا ہوگا۔

شریعتِ اسلامی کے اس عظیم پھل آور درخت کی شاخیں چاروں فقہی مذاہب ہیں جو اس درخت کے ایک ہی تنے سے خوراک اور قوت حاصل کرتے ہیں۔ یہ چاروں فقہی مذاہب بالواسطہ طور پر صرف اور صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے چشمہ سے ہی فیض یاب ہوتے ہیں۔ ان چاروں مذاہب کے اماموں کا مقامِ اتصال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ذاتِ مبارک ہے۔ مزید وضاحت کے لیے درج ذیل شجرہ ملاحظہ ہو۔

امام ابوحنیفہؒ ، علقمہؒ / عطاءؒ ، ابن عباسؓ / ابن مسعودؓ	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
امام مالکؒ ، سعید بن المسیب / نافعؒ ، عبداللہ بن عمرؓ	
امام شافعیؒ ، امام مالکؒ ، سعید بن المسیب / نافع ، عبداللہ بن عمرؓ	
امام احمد بن حنبلؒ ، امام شافعیؒ ، امام مالکؒ ، سعید بن المسیبؒ / نافعؒ ، ابن عمرؓ	

دینِ اسلام کو قبول کرنے کے لیے چونکہ زبان، رنگ، نسل اور علاقہ وغیرہ کی کوئی شرط

نہیں ہے اس لیے اسلام کا دامن اتنا وسیع ہے کہ کسی بھی زبان، رنگ، نسل اور علاقہ وغیرہ کے لوگ اس فطری نظامِ زندگی قبول کریں تو کسی کو بھی اس میں تنگیٔ داماں اور تنگیٔ سامان کی شکایت نہیں ہوگی۔ فقہاء کرام نے غیر منصوص احکام میں خاص طور پر فقہی فکر و تدبر کر کے ان کی تمام امکانی صورتیں پیش کر دی ہیں جن کو مختلف حالات میں اختیار کیا جا سکتا ہے اور یہ عذر تراشنا ممکن نہیں ہے کہ اسلام فلاں مسئلہ میں رہنمائی نہیں کرتا یا فلاں صورتِ حال میں شرعی و فقہی احکامات پر عمل درآمد کرنا انسانی زندگی کے لیے دشواری کا باعث بنتا ہے۔ اسلام کے دائرے میں داخل شخص ہر مشکل مرحلے میں اسلام میں گنجائش اور سہولت پائے گا۔ ان گنجائشوں اور سہولتوں کے پیدا کرنے میں فقہی اختلافات کا بہت بڑا حصہ ہے۔

نظریہ "مراعاۃ الخلاف" کا تعلق فقہی اختلافات سے ہے لہٰذا اگر خود اس نظریہ سے اختلاف کیا جائے تو اس میں کوئی اچنبھے والی بات نہیں۔ علماء کرام کا ایک گروہ اس نظریہ کی مخالفت کرتا ہے۔ اس نظریہ کی مخالفت کرنے والوں میں کون کون ہیں اور وہ کیا کہتے ہیں، ذیل میں ملاحظہ ہو۔

مخالفین علامہ ابن عبد البر کہتے ہیں:

"لا یجوز للعامی تتبع الرخص [۱۳]"

ایک عامی کے لیے رخصتوں کی پیروی کرنا جائز نہیں ہے۔

امام ابن حزم، احمد اور المروزی کے نزدیک ہر مذہب کے صرف آسان اور سہولتوں والے احکامات پر عمل کرنا فسق ہے [۱۴]

امام الاوزاعی کا قول ہے:

"من اخذ بنوادر العلماء خرج عن الاسلام [۱۵]"

جس نے علماء کے نادر اقوال کو لیا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

الباجی نے احکامات میں اختلافات کا اعتبار کرنے کے خلاف روایت کیا ہے [۱۶]

علامہ شاطبی کے نزدیک بھی کسی مسئلہ میں اختلافی آراء میں سے کسی ایک رائے کو اختیار کرنا درست نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"لیس للمقلد أن یتخیر فی الخلاف [۱۷]"

کسی ایک مقلد کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ اختلافات میں سے جس کسی ایک کو چاہے اختیار کرے۔

وہ مختلف مذاہب کی سہولتوں اور رخصتوں کو اختیار کرنے کو خواہشاتِ نفس کی پیروی قرار دیتے ہیں۔ علامہ شاطبی کے الفاظ ہیں:

"تتبع الرخص میل مع اھواء النفوس والشرع جاء بالنھی عن اتباع الھوی[۱۸]"

رخصتوں کی پیروی کرنا خواہشاتِ نفس کی طرف مائل ہونا ہے اور شریعت خواہشاتِ نفس کی اتباع کرنے سے منع کرتی ہے۔

علامہ شاطبی ایک مقلد کو اختلافات میں سے کسی ایک کو اپنانے میں صوابدیدی اختیار نہیں دیتے بلکہ ان کے نزدیک مقلد کو چاہیے کہ وہ اجتہاد اور ترجیح کی بنا پر کسی ایک رائے کو اختیار کرنے اور کسی ایک ہی کے فتوے پر عمل کرے۔

"لا یجوز للعامی اتباع المفتیین معًا ولا احدھما من غیر اجتھاد ولا ترجیح[۱۹]"

ایک عام شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دو مفتیوں کی بیک وقت یا ان میں سے کسی ایک کی اجتہاد اور ترجیح کے بغیر اتباع کرے۔

امام احمد، ابن سریج اور القفال کا موقف بھی علامہ شاطبی کے موقف سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"لا یتخیر بینھم حتی یأخذ بقول من شاء منھم بل یلزمہ الاجتھاد فی اعیان المفتیین من الاورع والادین والأعلم[۲۰]"

ایک عام شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ (مفتیوں میں سے) جس کا چاہے قول اختیار کرے بلکہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اجتہاد کے ذریعے ان میں سے ورع، دین اور علم میں سب سے بہتر کے قول کو اختیار کرے۔

اگر کسی مسئلہ میں اختلافی اقوال موجود ہوں تو ایک عامی کو یہ اجازت نہیں کہ وہ ان میں سے جس قول کو چاہے اختیار کرے۔ اس امر کی وضاحت میں علامہ شاطبی لکھتے ہیں:

"لأن كل واحد منهما متبع لدليل عنده يقتضي ضد ما يقتضيه دليل صاحبه، فهما صاحبا دليلين متضادين، فإتباع احدهما بالهوى اتباع للهوى، ..... فليس إلا الترجيح بالاعلمية وغيرها، وايضا فالمجتهدان بالنسبة إلى العامي كالدليلين بالنسبة إلى المجتهد، فكما يجب على المجتهد الترجيح أو التوقف كذلك للمقلد[۲۱]"

کیونکہ ان دونوں (مفتیوں) میں سے ہر ایک کے پاس ایسی دلیل ہے جو دوسرے کی دلیل کے برعکس تقاضا کرتی ہے۔ لہٰذا یہ دونوں متضاد دلیلوں کے حامل ہیں ان دونوں میں سے کسی ایک کی پیروی خواہشات کی پیروی ہے ..... لہٰذا ان میں سے کسی ایک کو علمی طور پر ترجیح دینی چاہیے ایک عامی کے لیے دو مجتہدوں کی حیثیت وہی ہے جو ایک مجتہد کے لیے دو دلیلوں کی ہے جس طرح ایک مجتہد پر واجب ہے کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے یا توقف کرے اسی طرح ایک مقلد پر بھی یہی واجب ہے۔

نظریہ "مراعاۃ الخلاف" کے تحت سہولتوں اور رخصتوں کو اختیار کرنے پر ایک اعتراض یہ ہے کہ اس سے ایک سے زیادہ فقہی مذاہب کی پیروی لازم آتی ہے۔ اگر ایک شخص کسی خاص مذہب مثلاً حنفی مذہب کا پیروکار ہے تو کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی مسئلہ میں اپنے مذہب کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کے قول کو اختیار کرے۔ علامہ آلامدی کہتے ہیں کہ اس کے بارے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے ایک گروہ اس کو جائز قرار دیتا ہے کیونکہ کسی شخص پر یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ صرف ایک خاص مذہب کا ہی پابند ہو۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے اگر کوئی شخص ایک مذہب کا پیروکار ہے تو وہ مذہب اس کے لیے لازم ہو گیا ہے۔ آلامدی اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"والمختار هو أن كل مسألة من مذهب الأول اتصل عمله بها فليس له تقليد الغير فيها، وما لم يتصل عمله بها فلا مانع من اتباع غيره فيها [۲۲]"

رائے مختار یہ ہے کہ ایک شخص جب پہلے مذہب کے کسی مسئلہ پر عمل کر لیتا ہے تو پھر اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس مسئلہ میں کسی دوسرے مذہب کی تقلید کرے لیکن اگر اس نے پہلے مذہب پر عمل نہیں کیا تو پھر اس مسئلہ میں کسی دوسرے مذہب کی اتباع کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

صاحب جامع الفتاویٰ کہتے ہیں :

"يجوز للحنفي أن ينتقل إلى مذهب الشافعي وبالعكس لكن بالكلية أما في مسألة واحدة فلا يمكن [۲۳]"

ایک حنفی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حنفی مذہب کو چھوڑ کر شافعی مذہب اختیار کرلے۔ اسی طرح ایک شافعی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حنفی مذہب کا پیروکار بن جائے لیکن یہ انتقالِ مذہب مکمل طور پر ہونا چاہیے۔ صرف ایک مسئلہ میں کسی دوسرے مذہب کی تقلید کرنا درست نہیں۔

نظریہ "مراعاۃ الخلاف" کے مخالفین کی مندرجہ بالا آراء کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ فقہائے کرام کی اختلافی آراء سے رعایت حاصل کرتے ہوئے مختلف مذاہب کی سہولتوں اور رخصتوں کو اختیار کرنا درست نہیں کیونکہ ایسا کرنے سے :

۱۔ ایک سے زیادہ مذاہب کی پیروی لازم آتی ہے جبکہ ایک شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف ایک ہی فقہی مذہب کی تقلید کرے۔

۲۔ مختلف مذاہب کی سہولتوں اور رخصتوں سے استفادہ کرنا خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرنا ہے جو کہ شرعی طور پر منع ہے۔

مجوّزین | جو علماء کرام فقہی اختلافات سے سہولتیں حاصل کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں ان کی آراء درج ذیل ہیں۔

فقہی اختلافات کا آغاز صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کے وقت ہی ہوگیا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے ان فقہی اختلافات کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پوتے حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ نے یہ فرمایا تھا:

"لقد نفع اللہ باختلاف اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اعمالھم۔ لایعمل العامل بعمل رجل منھم إلا رأی أنہ فی سعۃ ورأی أنہ خیرا منہ قد عملہ۔ وعنہ ایضا: أی ذلک اخذت بہ لم یکن فی نفسک منہ شئ [۲۴]"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کے مابین ان کے اعمال میں پائے جانے والے اختلافات سے اللہ تعالیٰ نے یہ فائدہ پہنچایا کہ ان صحابہؓ میں سے کسی ایک صحابی کے طرز عمل کے مطابق جب کوئی شخص عمل کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو گنجائش اور سہولت میں پاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس نے جو کام کیا ہے وہ ایسا کام ہے جسے اس سے بہتر آدمی نے کیا تھا۔ حضرت قاسم بن محمدؓ کا ہی ایک قول یہ ہے کہ ان اختلافات میں سے جس کو بھی تم اختیار کر لو تو پھر تمہارے دل میں کوئی کھٹکا نہ رہے۔

حضرت عون بن عبداللہ نے فرمایا:

"ما أحب ان اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یختلفوا فإنھم لو اجتمعوا علی شئ فترکہ رجل ترک السنۃ ولو اختلفوا فأخذ رجل بقول احد أخذ بسنۃ [۲۵]"

میرے لیے یہ بات پسندیدہ نہیں کہ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم اختلاف نہ کرتے۔ اگر وہ ایک ہی چیز پر متفق ہو جائے تو اس کو چھوڑنے والا سنت کا تارک ہوتا۔ جب انہوں نے اختلاف کیا تو ان میں سے جس کسی کے قول کو کوئی اختیار کرے تو اس نے سنت کو اختیار کیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا تھا:

"ما یسرنی انهم لم یختلفوا [۲۶]"
اگر وہ (صحابہؓ) اختلاف نہ کرتے تو یہ بات مجھے اچھی نہ لگتی۔
حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے:
"لاتقولوا اختلف العلماء فی کذا وقولوا قد وسع العلماء علی الامة بکذا [۲۷]"
یہ مت کہو کہ علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے بلکہ یہ کہو کہ اس طرح علماء نے امت کے لیے وسعت پیدا کی ہے۔
البانی نے شیرازی سے یہ روایت کیا ہے کہ احکامات میں اختلافات میں اعتبار کرنا جائز ہے [۲۸]
امام الزناقی کہتے ہیں:
"یجوز تقلید کل من اهل المذاهب فی النوازل [۲۹]"
سخت مصیبت کی حالت میں اہل مذاہب میں سے ہر ایک کی تقلید کرنا جائز ہے
امام ابن الہمام کا قول ہے:
"ولا یمنع منه مانع شرعی۔ إذ للانسان أن یسلك لأخف علیه [۳۰]"
کوئی شرعی مانع ایک شخص کو اس امر سے منع نہیں کرتا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے تخفیف اور سہولت والا راستہ اختیار کرے۔
علامہ جلال الدین سیوطی کی رائے ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے موجودہ مذہب کی نسبت کسی دوسرے مذہب میں آسانی پاتا ہے تو اس پر آسان مذہب کو اختیار کرنا واجب ہے [۳۱]
علامہ شاطبی کا ایک قول یہ بھی ہے:
"فإن اقوال العلماء بالنسبة إلی المقلدین کأقوال المجتهدین ویجوز کل واحد علی قول الجماعة ان یقلد من العلماء من شاء وهو من ذلك فی سعة [۳۲]"

مقلدین کے لیے علماء کے اقوال مجتہدین کے اقوال کی مانند ہیں۔ ہر ایک کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ ان کے اقوال میں سے جن میں فراخی و آسودگی پائے اُنکی پیروی کرے۔

علامہ عبدالوہاب الشعرانی کہتے ہیں:

أن الشعريعة لوكانت جاءت على احدى مرتبتي الميزان فقط لكان حرج شديد على الأمة في قسم التشديد ولم يظهر للدين شعار في قسم التخفيف۔ وكان كل من قلد اماما في مسئلة قال فيها بالتشديد لا يجوز العمل بقول غيره في مضايق الاحوال الضرورات فكانت المشقة تعظم على الأمة بذلك فالحمد لله الذى جاءت شريعة نبينا محمد صلى الله عليه وسلم على اكمل حال بحكم الاعتدال فلا يوجد فيها شئ فيه مشقة على شخص إلا ويوجد فيها شئ آخر فيه التخفيف عليه إما حديث أو اثر أو قول امام آخر أو قول فى مذهب ذلك الشديد مرجوع يخفف عنه[۳۳]

اگر شریعت تشدید اور تخفیف کی بجائے ان میں سے کسی ایک حکم کے ساتھ آتی اس میں امت کے لیے بہت سختی ہوتی اور دین میں تخفیف و سہولت جیسی کوئی چیز نہ ملتی ایک شخص جو کسی مسئلہ میں ایسے امام کی پیروی کرتا ہو جس کا اس مسئلہ میں سخت موقف ہے اور ایسے شخص کے لیے تنگی اور ناگزیر حالات میں کسی دوسرے امام کے قول پر عمل کرنا جائز نہ ہوتا تو اس سے امت پر مشقت بڑھ جاتی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ہر حال میں اعتدال کا حکم لے کر آئی ہے۔ اس میں کسی بھی شخص کے لیے مشقت نہیں ہے۔ اگر مشقت ہو بھی تو کسی دوسری طرف سے تخفیف میسر آسکتی ہے کسی حدیث سے یا کسی اثر سے یا کسی دوسرے امام کے قول سے یا اسی مذہب کے، جس میں سختی پائی گئی ہے، کسی دوسرے قول سے

تخفیف مل جائے گی۔

ایک یا اس سے زیادہ مذاہب یا فقہاء کے اقوال کو اختیار کرنے کے بارے میں علماء کہتے ہیں۔

قاضی ابوبکر الباقلانی کا قول ہے:

"یجوز للعامی من شاء من العلماء [۳۴]"

ایک عامی کے لیے جائز ہے کہ وہ علماء میں سے جس کی چاہے پیروی کرے۔

امام الرافعی ایک مسلک کی بجائے دوسرا مسلک اختیار کرنے کے قائل ہیں [۳۵]"

ایک مجتہد کے پیروکار کے لیے ایک مسئلہ میں کسی دوسرے مجتہد کے حکم کی اتباع کرنے کے جواز میں علامہ الآمدی لکھتے ہیں:

"وانه لم ینقل عن احد من السلف الحجر علی العامة فی ذلك [۳۶]"

علمائے سلف میں سے کسی سے بھی اس سلسلہ میں عوام پر کوئی ممانعت منقول نہیں ہے۔

قاضی ابوبکر کی رائے ہے کہ ایک شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ علماء میں سے جس سے چاہے سوال پوچھے اور جس کے قول کو چاہے اختیار کرے وہ علماء علم و فضل میں برابر ہوں یا بڑھے ہوئے ہوں۔ الآمدی نے قاضی ابوبکر کے اس قول کو رائے مختار قرار دیا ہے [۳۷]

امام ابن المنذر کا تو یہ کہنا ہے کہ

"اذا ثبت عن الشارع صلی اللہ علیه وسلم فعل امرین فی وقتین فهما علی التخیر ما لم یثبت النسخ [۳۸]"

جب کسی ایک فعل کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف اوقات میں دو حکم ملتے ہوں اور ان میں سے کسی ایک کے بارے میں نسخ ثابت نہ ہو تو ان دونوں حکموں میں سے کوئی ایک اختیار کیا جا سکتا ہے۔

جب ایک فعل کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو حکموں میں سے کسی ایک حکم پر عمل کرنا درست ہے تو کسی ایک مسئلہ کے بارے میں دو یا زیادہ فقہی آراء میں سے کسی

ایک رائے پر عمل کرنا درست کیوں نہیں ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کہتے ہیں:

"ہندوستان یا ماوراء النہر کے کسی خطے میں ایک جاہل مسلمان رہ رہا ہے اور اس کے قرب وجوار میں کوئی شافعی یا مالکی یا حنبلی عالم دین موجود نہیں، نہ ہی تینوں مذاہب کی کوئی کتاب موجود ہے تو ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ مذہب ابوحنیفہؒ کی تقلید کرے اور حرام ہے کہ دائرہ حنفیت سے قدم باہر نکالے کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو (دائرہ حنفیت کے ساتھ ہی) دائرہ اسلام سے بھی باہر جا پڑے گا اور اس کے دین وایمان کا کوئی وزن باقی نہ رہ جائے گا بخلاف اس کے اگر ایسا شخص حرمین میں ہو تو مخصوص طور پر کسی ایک ہی عالم کی تقلید واجب نہ ہوگی۔ کیونکہ وہاں اس کے لیے ہر مذہب فقہی سے رہنمائی حاصل کرنا ہمہ دم ممکن ہے[۳۹]"

محمد زکریا السبر دیسی کہتے ہیں:

"ولا یلزم هذا المقلد أن یتبع فی تقلیده اماما معینا فله أن یقلد من شاء حتی لو اتبع مذهبا من مذاهب الأئمة الاربعة وجدت له حادثة یجد حکمها فی المذهب الآخر أیسر من المذهب الذی یقلده له أن یأخذ برأی المذهب الاخر تیسرا علیه علی ما هو الراجح عند العلماء فأن اختلاف المجتهدین فی الآراء رحمة بالنّاس وتوسعة علیهم[۴۰]"

کسی مقلد کے لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ کسی ایک معین امام کی پیروی کرے بلکہ وہ جس کی چاہے تقلید کر سکتا ہے۔ اگر وہ آئمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے مذہب کی اتباع کرتا ہے اور اسے ایسا واقعہ پیش آجاتا ہے جس کے بارے میں حکم اس کے اپنے اختیار کردہ مذہب کی نسبت دوسرے مذہب میں زیادہ آسان ملتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ دوسرے مذہب کی رائے کو اختیار کرے

جو اس کے لیے زیادہ آسان ہے کیونکہ مجتہدین کی آراء میں اختلاف لوگوں کے لیے رحمت اور کشادگی کا باعث ہے۔

ڈاکٹر عبدالکریم الزیدان کی رائے ہے:

"یجوز لمتبع مذهب معین أن یتبع غیره فی بعض المسائل ولا الزام علیه بالتقلید بجمیع اجتهادات هذا المذهب"[۴۱]

ایک معین مذہب کے پیروکار کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ بعض مسائل میں کسی دوسرے مذہب کی اتباع کرے۔ اس پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ تمام اجتہادات میں اپنے معین مذہب کا پابند رہے۔

وہ مزید کہتے ہیں:

"ولا یلزمه أن یسأل عالما معینا ولا یتقید بواحد معین لأن الله لم یلزمه"[۴۲]

اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ کسی ایک معین عالم سے ہی مسئلہ پوچھے اور نہ ہی اس پر کسی ایک معین عالم کی تقلید لازم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس بات کا پابند نہیں بنایا ہے۔

محمد خضری بک کا موقف ہے:

"فلیس علیه ان یلتزم فی جمیع الواقعات مذهب من قلده فی واقعة فلا مانع أن یقلد ابا حنیفة فی امر ویقلد الشافعی فی امر اٰخر"[۴۳]

لہٰذا اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ اگر اس نے ایک واقعہ میں کسی مذہب کو اختیار کیا ہے تو وہ باقی تمام واقعات میں بھی اسی مذہب ہی کی تقلید کرے گا بلکہ اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ وہ کسی ایک امر میں امام ابوحنیفہؒ کی پیروی کرے اور کسی دوسرے امر میں امام شافعی کی اتباع کرے۔

سید علی الخواص کا قول ہے:

"لا یکمل لمؤمن بالشریعة کلها وھو متقلد بمذھب واحد ابدا ولو قال صاحبه اذا صح الحدیث فھو مذھبی لترک ذلک المقلد الأخذ باحادیث کثیرة صحت عند غیر امامه"

ہمیشہ ایک ہی مذہب کی تقلید کرنے والے شخص کا شریعت پر مکمل طور پر عمل نہیں ہو سکتا اگرچہ اس کے امام نے یہ کہا ہو کہ صحیح حدیث میرا مذہب ہے کیونکہ ایسے مقلد سے وہ بہت ساری احادیث ترک ہو جاتی ہیں جو اس کے مذہب کے امام کے علاوہ کسی دوسرے امام کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں۔

یہ تھے اختلافی اقوال کے اعتبار یا عدم اعتبار کے بارے میں مختلف علماء کے خیالات۔

نظریہ "مراعاة الخلاف" کے مخالفین کے اقوال کی روشنی میں جو دو بڑے اعتراضات سامنے آئے ہیں وہ ذیل میں مختصراً مکرر درج کیے جا رہے ہیں تاکہ ان اعتراضات کے وزن کا اندازہ لگایا جا سکے۔

۱۔ مختلف مذاہب کی سہولتوں کو اپنانا خواہشاتِ نفس کی پیروی ہے جو کہ شرعی طور پر منع ہے۔

۲۔ اس نظریہ پر عمل کرنے سے ایک سے زیادہ مذاہب کی تقلید لازم آتی جبکہ ایک شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف ایک ہی فقہی مذہب کا مقلد ہو۔

پہلے اعتراض کا جواب

یہ اعتراض کہ فقہی مذاہب کی رخصتوں اور سہولتوں کو اختیار کرنا خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنا ہے اور خواہشاتِ نفس کی پیروی سے شریعت منع کرتی ہے، اس کا آخری حصہ درست ہے لیکن اس اعتراض کے پہلے حصہ پر اعتراض ہے۔ یہ بات اوپر دلائل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ تمام فقہاء کرام کا اجتہاد لائق اجر و ثواب ہے کسی ایک مختلف فیہ مسئلہ میں آئمہ اربعہ کی یا ان میں سے بعض کی اختلافی آراء میں سے کوئی ایک رائے گناہ تصور نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان کی بنیاد اجتہاد پر ہے اور اجتہاد قرآن و سُنّت کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اختلافی فقہی آراء میں سے کسی آسان

رائے کو اختیار کرنا خواہشاتِ نفس کی پیروی نہیں بلکہ سنتِ نبویؐ کی پیروی ہے۔ اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دو اختیاری باتوں میں سے آسان بات اور صورت کو اختیار فرماتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا فرمانا ہے:

"ما خُیِّر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین قط إلا اخذ ایسرهما مالم یکن إثما فإن کان إثما کان أبعد الناس منه [۴۵]"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو امر کے درمیان جب بھی اختیار دیا گیا تو ان میں سے جو آسان صورت ہوتی اس کو آپؐ نے اختیار کیا بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اگر وہ گناہ ہوتا تو لوگوں میں سب سے زیادہ دور رہنے والے ہوتے یعنی سب سے زیادہ بچتے۔

اگر ایک شخص شریعت کے احکام میں موجود رخصتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے تو کوئی بھی اسے خواہشاتِ نفس کی پیروی قرار نہیں دے گا۔ شریعت خود بعض معاملات میں مکلف کو دو یا دو سے زیادہ حکموں میں سے کسی ایک پر عمل کرنے کا اختیار دیتی ہے اور جس چیز کو شریعت حلال قرار دے اسے کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ لہٰذا اگر شریعت کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانا خواہشاتِ نفس کی پیروی نہیں ہے جو کہ فقہی مذہب پر بالاتر حجت ہے تو پھر فقہی مذاہب سے میسّر آنے والی سہولتوں سے استفادہ کرنا خواہشاتِ نفس کی اتباع کیوں ٹھہرا؟

شریعت کا حکم ہے کہ رمضان میں جان بوجھ کر روزہ توڑنے والا کفارہ ادا کرے گا۔ کفارہ ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں ان میں سے کوئی ایک صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔

وہ تین صورتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک غلام آزاد کرنا۔

۲۔ دو ماہ متواتر روزے رکھنا۔

۳ - ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دینا -

اب اگر ایک شخص ان تینوں میں سے کوئی ایک صُورت اپنی سہولت کے مطابق اختیار کرتا ہے تو اس کا یہ اقدام خواہشاتِ نفس کی نہیں بلکہ شریعت کی پیروی ہوگا - بلکہ ایک صحابی کے واقعہ میں تو محسنِ انسانیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ بالا تینوں صورتوں سے بڑھ کر تخفیف اور سہولت کی ایک چوتھی صُورت پیدا کر دی تھی - اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شریعت اپنے اوپر ایمان لانے والوں کے لیے کس قدر سہولت کی گنجائش پیدا کرتی ہے -

اس دلچسپ واقعہ کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں جس کی تفصیل یوں ہے :

"جاء رجل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال هلكتُ - قال وما ذاك ؟ قال وقعتُ بأهلي في رمضان قال تجد رقبة - قال لا - قال هل تستطيع أن تصوم شهرين متتابعين - قال لا - قال افتستطيع أن تطعم ستين مسكينا - قال لا - قال فجاء رجل من الانصار بعرق المكتل فيه تمر - فقال اذهب بهذا فتصدق به - قال على أحوج منا رسول الله ؟ والذى بعثك بالحق ما بين لابتيها اهل بيت أحوج منا - ثم قال اذهب فاطعمه اهلك[۲۷]"

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ میں ہلاک ہوگیا - آپؐ نے فرمایا کیا بات ہے؟ اس نے کہا میں نے اپنی بیوی سے رمضان میں صحبت کر لی ہے آپؐ نے پوچھا کیا تیرے پاس غلام ہے ؟ اس نے کہا نہیں - آپ نے فرمایا کیا تُو دو مہینے متواتر روزے رکھ سکتا ہے ؟ اس نے کہا نہیں - آپؐ نے فرمایا کیا تُو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے ؟ اس نے کہا نہیں - اتنے میں انصار میں سے ایک آدمی ایک عرق کھجور لے کر آیا - عرق ایک پیمانہ ہے - آپ نے فرمایا اس کو لے جا اور صدقہ کر - اس نے پوچھا یا رسول اللہ ! اپنے سے زیادہ حاجت مند کو دوں ؟ قسم ہے

اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ مدینے کی دونوں پتھریلی زمینوں کے درمیان کوئی گھر مجھ سے زیادہ محتاج نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا جا اور اپنے گھر والوں کو کھلا دے۔

لہذا اگر شریعت کے احکام میں موجود سہولتوں سے فائدہ اٹھانا اتباعِ اھوا نفس نہیں بلکہ شریعت ہی کی پیروی ہے تو فقہی احکام کے بارے میں اختلافی آرا سے سہولتیں حاصل کرنے پر خواہشاتِ نفس کی پیروی کا الزام درست نہیں ہے۔ ہر حالت میں ایک ہی فقہی مذہب کی تقلید کرنا اور سختی اور تنگی کے حالات میں فقہی مذاہب کی سہولتوں سے استفادہ کرنے سے منع کرنا دین میں سختی پیدا کرنے کے مترادف ہے جبکہ دین آسانی کا نام ہے اور اس میں سختی پیدا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"وما جعل علیکم فی الدین من حرج"[47]

اور اس (اللہ) نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عن ابی ھریرۃؓ: إن الدین یُسرٌ ولن یشاد الدین احد الا غلبہ"[48]

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین بہت آسان ہے اور جو شخص دین میں سختی پیدا کرے گا دین اس پر غالب آجائے گا۔

ایک اور حدیث ہے:

"عن سعید بن ابی بُردۃ عن ابیہ عن جدہ قال لمّا بعثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومعاذ بن جبل قال لھما: یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا"[49]

سعید بن ابی بردہ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے

ہیں کہ جب ان کو اور معاذ بن جبل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمن بھیجنے لگے تو آپؐ نے دونوں کو فرمایا: آسانی پیدا کرنا سختی نہ کرنا اور خوشخبری سنانا نفرت نہ دلانا بلکہ شوق دلانا۔

دوسرے اعتراض کا جواب

اب دوسرے اعتراض کا جائزہ لیا جاتا ہے اور وہ اعتراض یہ ہے کہ نظریہ "مراعاۃ الخلاف" پر عمل کرنے سے ایک سے زیادہ فقہی مذاہب کی پیروی لازم آتی ہے جبکہ ایک شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف ایک ہی مذہب کا پیروکار ہو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک سے زائد فقہی مذاہب کی پیروی کرنا شرعاً منع ہے اور کیا ایک ہی مذہب کی تقلید کرنا واجب ہے؟

دراصل غیر منصوص مسائل میں اختلافات کا آغاز فقہی مذاہب کے ائمہ کرام کے وقت سے ہی نہیں ہوا تھا بلکہ ان مسائل میں اختلافات کا صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں بھی پتہ چلتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کے فقہی اختلافات سے متعلق بھی لوگ سوال کرتے تھے کہ ایک اختلافی مسئلہ میں کس صحابی کے فقہی اجتہاد کی اتباع کی جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارک میں ہی اس مسئلہ کا حل بتلا دیا تھا۔ آپؐ نے مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ فرما دیا تھا کہ مسلمان جس صحابی کی بھی پیروی کریں گے راہِ ہدایت پر ہی گامزن رہیں گے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اصحابی کالنجوم فی السماء فایما اخذتم به فقد اهتدیتم"[۵۰]

میرے صحابہ آسمان کے ستاروں کی مانند ہیں تم نے ان میں سے جس کسی کے دامن کو بھی پکڑ لیا ہدایت پا گئے۔

نبی اکرمؐ کے حکم کے مطابق مسلمانوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سے جس صحابی کی چاہیں تقلید کریں۔ ایک صحابی کا درجہ کسی بھی فقہی مذہب کے ایک امام سے بلند تر ہے اگر کسی متعین صحابی کی پیروی کی پابندی مسلمانوں پر نہیں ہے تو فقہی مسائل میں کسی ایک متعین امام

اور مذہب کی پابندی مسلمانوں پر کیسے ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید کی ایک آیت ھے:

"فاسئلوا اهل الذكر إن كنتم لا تعلمون [۵۱]"

اگر تم نہیں جانتے تو اہل الذکر یعنی جاننے والوں سے پوچھ لو۔

مندرجہ بالا آیت ایک شخص کو کسی متعین عالم سے کسی مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کا پابند نہیں بناتی۔

ائمہ کرام میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ بات نہیں ملتی کہ انہوں نے اپنے پیروکاروں یا اپنے بعد میں آنے والوں کو اس چیز کا پابند بنایا ہو کہ وہ صرف انہی کے مذہب کی تقلید کریں اور جو مذہب ان کے مذہب کے خلاف رائے رکھتا ہو اس کی صحت کو تسلیم نہ کریں اور اسے باطل سمجھیں بعد کے لوگوں نے اگر ایسی کوئی پابندی لگائی ہے تو ائمہ کرام یقیناً اس سے بری الذمہ ہیں۔ انسانوں میں صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ایسی ہے جن کی مکمل اور غیر مشروط تقلید مسلمانوں پر واجب ہے۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فعل اور ہر قول کو وحی الٰہی کی تائید حاصل ہے۔ نبی کے علاوہ کوئی اور شخص ایسی تقلید کا استحقاق نہیں رکھتا کیونکہ تقلید نام ہے بغیر دلیل و حجت کے کسی کے قول کو مان لینے کا۔

"التقليد هو قبول قول بلا حجة [۵۲]"

کسی قول کو بغیر حجت کے قبول کر لینا تقلید کہلاتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا بہت مشہور قول ہے:

"ما جاء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فعلى الرأس والعين بأبي وأمي وليس لنا مخالفته وما جاء عن اصحابه تخيرنا وما جاء عن غيرهم فهم رجال ونحن رجال [۵۳]"

جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ پر میرے باپ ماں قربان۔ سے پہنچا وہ سر اور آنکھوں پر ہم اس کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ جو حضورؐ کے صحابہؓ سے پہنچا اس میں ہمیں اختیار ہے اور ان کے علاوہ کسی اور سے کچھ ہم تک پہنچا تو

وہ بھی انسان ہیں اور ہم بھی انسان ہیں ۔ (لہٰذا ہم اس کے قول کے پابند نہیں) ۔

امام مالک نے فرمایا :

"ہر شخص کے اقوال دو قسم کے ہوتے ہیں کچھ لینے کے قابل اور کچھ رد کر دینے کے قابل صرف ایک ذات اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات معصوم ہے[۵۴]"

امام شافعی کا قول ہے :

"لا یحل تقلید احد سوی النبی صلی اللہ علیہ وسلم[۵۵]"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کی تقلید جائز نہیں ۔

امام احمد بن حنبل نے فرمایا :

"اللہ اور رسول کے مقابلے میں کسی کی رائے کو وقعت حاصل نہیں تم نہ میری تقلید کرو اور نہ کسی اور امام کی[۵۶]"

کسی ایک ہی فقہ کو عین حق مان کر اس پر عمل کرنا شاہ ولی اللہ کے نزدیک غیر اللہ کی پرستش کے مترادف ہے ۔ آپ فرماتے ہیں ۔

"پس کسی امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرنا کہ اس کی زبان عین شریعت کی زبان ہے یقیناً غیر اللہ کی پرستش ہے[۵۷]"

ائمہ کرام کا "مراعاۃ الخلاف" پر عمل

تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ خود ائمہ کرام اور فقہاء کرام بھی نظریہ "مراعاۃ الخلاف" پر عمل کرتے ہوئے مخصوص حالات میں اپنے فقہی مسلک کو چھوڑ کر مخالف فریق کے موقف کو اختیار کر لیتے تھے ۔

امام شافعیؒ فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں ایک مرتبہ جب امام شافعیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی قبر کے قریب نماز فجر ادا کی تو انہوں نے دعائے قنوت نہ پڑھی کیونکہ امام ابوحنیفہؒ نماز فجر میں دعائے قنوت پڑھنے کے قائل نہیں[۵۸] امام شافعیؒ نے اس موقع پر یہ فرمایا تھا :

"بسا اوقات ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں ۵۹"

امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ، جو اپنے زمانے میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدے پر فائز رہے ہیں، کا ایک مشہور واقعہ ہے:

"آپ نے جمعہ کے روز غسل کیا اور لوگوں کو نماز پڑھائی نماز پڑھ کر جب لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تو آپ کو اطلاع دی گئی کہ حمام کے کنویں میں ایک مرا ہوا چوہا موجود ہے۔ امام موصوف نے یہ سُن کر فرمایا: تو پھر اس وقت ہم اپنے مدنی بھائیوں کے مسلک پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی دو "قلہ" کی مقدار میں ہو تو وہ نجس نہیں رہتا۔ اس کا حکم ماء کثیر کا ہو جاتا ہے ۶۰"

اسی طرح مالکی فقہ کے علماء نے نکاحِ فاسد کے مسئلہ میں عورت کی میراث اور مہر وغیرہ کے متعلق فیصلہ دیتے ہوئے حنفی فقہ کی مخالف رائے کی رعایت کو مدنظر رکھا۔ احناف نکاحِ فاسد میں عورت کے حقِ میراث اور حقِ مہر وغیرہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "بدائع الصنائع" میں درج ہے:

"وأما النكاح الفاسد فلا حكم له قبل الدخول وأما بعد الدخول فيتعلق به احكام... ۶۱"

فاسد نکاح کا مجامعت سے قبل کوئی حکم نہیں ہے لیکن مجامعت کے بعد نکاح سے سارے احکام ثابت ہوں گے۔

حنبلی فقیہہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"فأما النكاح الفاسد فلا يثبت به التوارث بين الزوجين ۶۲"

نکاحِ فاسد سے میاں بیوی کے درمیان وراثت ثابت نہیں ہوگی۔

فقہائے حنابلہ کی طرح مالکی فقہاء بھی نکاحِ فاسد کے نتیجے میں حقوق ثابت نہیں کرتے تھے لیکن نظریہ "مراعاۃ الخلاف" کی رو سے مالکیوں نے اس عورت کو اس کے شوہر کی وفات کے بعد حقِ وراثت اور حقِ مہر دلایا جس کا نکاح فاسد تھا۔

مالکی فقیہہ امام شاطبی لکھتے ہیں:

"مثاله استحقاق المرأة المهر، وكذا الميراث مثلا عند مالك فيما تزوجت بغير ولي فمالك مع كونه يقول بفساد النكاح بدون ولي: يراعي في ذلك الخلاف عندما ينظر فيما ترتب بعد الوقوع[۶۲]"

ایک مثال عورت کا حق مہر اور حق میراث ہے۔ امام مالک کے نزدیک اگر عورت بغیر ولی کے نکاح کرے تو اس کا نکاح فاسد ہو جاتا ہے لیکن اس نکاح کے وقوع پذیر ہو جانے کے بعد جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان میں پائے جانے والے اختلاف کی رعایت کرتے ہوئے امام مالک نے عورت کو میراث اور مہر وغیرہ کی مستحق قرار دے دیا۔

اس طرح ایک ایسی عورت جو فقہ مالکی کی رو سے جن حقوق سے محروم ہو رہی تھی، اسے نظریہ "مراعاۃ الخلاف"، کے تحت فقہ حنفی کی مخالف رائے سے وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے۔

یوں تاریخی طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں بھی شروع ہی سے فقہی اختلافات کا اعتبار کیا گیا۔ مذکورہ بالا تینوں مثالوں میں سے پہلی مثال میں امام شافعیؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے اس قول پہ عمل کیا جو ان کی اپنی فقہ کے مخالف تھا۔ دوسری مثال کے مطابق امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ نے فقہ مالکی کے اختلافی قول سے رعایت حاصل کرتے ہوئے اپنی فقہ میں موجود دشواری دور کی۔ جبکہ تیسری مثال میں مالکیوں نے احناف کے قول مخالف کو اپنایا۔ اگر خود ائمہ کرام اختلافات سے حاصل ہونے والی فقہی وسعتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو دوسروں کے لیے یہ وسعتیں اور سہولتیں اپنانا شجرِ ممنوعہ کیوں ٹھہرا؟

ذیل میں چند مزید مثالیں دی جا رہی ہیں جن سے یہ بات اور واضح ہو گی کہ ہماری روزمرہ زندگی میں پیش آنے والی بہت سی دشواریاں دور کرنے میں نظریہ "مراعاۃ الخلاف" کتنا کارآمد ہے۔

مثال نمبر ۱ شافعی مذہب کا ایک اصول ہے۔

"إن مطلق الأمر يقتضي التكرار[۶۳]"

مطلق امر کا صیغہ تکرار چاہتا ہے۔

جبکہ حنفی مذہب کا اصول اس کے برعکس ہے:

"انہ لا یقتضی التکرار[۶۵]"

مطلق امر کا صیغہ تکرار کا تقاضا نہیں کرتا۔

مندرجہ بالا اصولوں کے تحت احناف اور شوافع کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا نماز پڑھنے کے لیے ہر مرتبہ تیمم کیا جائے گا یا ایک ہی تیمم سے ایک سے زیادہ نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں۔

شوافع کا حکم یہ ہے:

"لا یجمع بین فریضتین بتیمم واحد"

ایک تیمم سے دو فرض نمازیں نہیں جائیں گی۔

اور احناف کے نزدیک حکم یہ ہے:

"یجوز الجمع بین فریضتین بتیمم واحد[۶۶]"

ایک تیمم سے دو نمازیں جمع کرنا یعنی پڑھنا جائز ہے۔

مندرجہ بالا مسئلہ میں احناف کے موقف میں تخفیف اور سہولت پائی جاتی ہے اگر کوئی شافعی المسلک ایک ہی تیمم سے دو یا زیادہ نمازیں ادا کرتا ہے تو اس کی نمازیں نظریہ "مراعاۃ الخلاف" کی رو سے درست ہوں گی۔

مثال نمبر۲ کرہ ارض کے بعض خطے ایسے ہیں جہاں کے باشندے ہماری طرح بود و باش اختیار کرنے اور خوراک کھانے سے قاصر ہیں مثلاً قطب شمالی اور قطب جنوبی وغیرہ یا وہ علاقے جہاں کے لوگ زمین میں لگنے والی اجناس سے محروم ہیں اور وہ صرف مچھلی یا مچھلی کی بجائے دیگر بحری جانوروں کو بطور خوراک استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ لوگ مسلمان ہیں یا اسلام قبول کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہے کہ انہیں اپنی غذائی ضروریات پوری کرتے وقت سمندری جانوروں کے حلال یا حرام ہونے سے متعلق اسلام کے احکامات کو جاننا ہوگا۔ سمندری جانوروں کی حلت و حرمت کا مسئلہ فقہاء کے درمیان اختلافی ہے فقہ حنفی میں درج ہے۔

"أما الذی یعیش فی البحر فجمیع ما فی البحر من الحیوان محرم الأکل إلا السمک خاصۃ فإنہ یحل اکلہ[۶۷]"

سمندر میں رہنے والے تمام جانوروں کا کھانا حرام ہے سوائے مچھلی کے اس کا کھانا حلال ہے۔

فقہ شافعی کا بحری جانوروں کے بارے میں یہ موقف ھے:

"حیوان البحر السمك منه حلال كيف مات وكذا غيره في الأصح [۶۸]"

بحری جانوروں میں سے مچھلی حلال ہے خواہ اس کی موت کیسے ہی واقع ہوئی ہو۔ دیگر جانوروں کے بارے میں بھی صحیح قول یہی ہے کہ وہ حلال ہیں۔

فقہ حنبلی میں سمندری جانوروں کے متعلق لکھا ھے:

"فأما ما لا يعيش إلا في الماء كالسمك وشبهه فإنه يباح بغير ذكاة [۶۹]"

وہ جانور جو پانی میں رہتے ہیں مثلاً مچھلی اور اس سے ملتے جلتے جانور، یہ سب بغیر ذبح کیئے مباح ہیں۔

ان کے مقابلے میں فقہ مالکی نے بحری جانوروں کے بارے میں جو توسیع پسندانہ اندازِ نظر اختیار کیا ہے وہ یہ ہے:

"صيد البحر مذكى كله عند مالك [۷۰]"

امام مالک کے نزدیک سمندر کا تمام شکار ذبح کے حکم میں ہے۔

فقہ مالکی کی ایک اور کتاب میں لکھا ھے:

"لا بأس بأكل جميع حيوان البحر [۷۱]"

تمام سمندری جانورں کو کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

لہذا ایسے علاقوں میں رہنے والے باشندے اگر شافعی یا حنفی ہوں تو نظریہ "مراعاۃ الخلاف" کے تحت فقہ مالکی کے موقف کو اپنا کر اپنی غذائی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔

مثال نمبر ۳ اسلام میں طہارت کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔ فقہ اسلامی میں طہارت کے مسائل بہت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ نجاستوں کے بارے میں فقہاء کرام مختلف الآراء

ہیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ کتنی مقدار لائقِ درگزر ہے اور کتنی نہیں ہے۔

"اختلف الناس فی قلیل النجاسات علی ثلاثة اقوال: فقوم رأوا قلیلها وکثیرها سواء وممن قال بهذا القول الشافعی۔ وقوم رأوا أن قلیل النجاسات معفوعنه، وحدوه بقدر الدرهم البغلی، وممن قال بهذا القول ابوحنیفة۔ وشذ محمد بن الحسن قال: إن کانت النجاسة ربع الثوب فما دونه جازت به الصلوة۔ وقال فریق ثالث: قلیل النجاسات وکثیرها سواء إلا الدم علی ما تقدم وهو مذهب مالک"[۲۷]

اگر نجاستیں تھوڑی مقدار میں ہوں تو ان کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں: ایک فریق کے نزدیک نجاست تھوڑی مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ایک ہی بات ہے۔
یہ امام شافعیؒ کا قول ہے۔ دوسرے فریق کے نزدیک تھوڑی مقدار میں پائی جانے والی نجاستیں قابلِ درگزر ہیں اور ان نجاستوں کی مقدار ایک درہم کے برابر ہے۔
یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔ امام محمد بن حسن کی رائے ہے کہ اگر نجاست ایک چوتھائی کپڑے یا اس سے کم مقدار میں ہو تو ان کپڑوں میں نماز ہو جائے گی۔ تیسرے فریق کا یہ موقف ہے کہ نجاستیں تھوڑی مقدار میں ہوں یا زیادہ مقدار میں برابر ہیں سوائے خون کے۔ اور یہ مالکی مذہب ہے۔

اب اگر ایک شخص کے کپڑے ناپاک ہو گئے ہیں اس نے فرض نماز ادا کرنی ہے لیکن صورتحال ایسی ہے کہ وہ اپنے ناپاک کپڑے پاک نہیں کر سکتا۔ اب اگر وہ کپڑوں کے ناپاک ہونے کو عذر سمجھتا ہے تو فرض نماز فوت ہوتی ہے اور اگر وہ نماز ادا کرتا ہے تو کپڑوں کی ناپاکی کی وجہ سے نماز کی شرائط میں سے ایک شرط پوری نہیں ہوتی۔ یہاں فقہاء کرام کا اختلاف کام آتا ہے اس مسئلہ میں فقہ حنفی کا نکتہ نظر وسیع ہے۔ دیگر مذاہب کے لوگ تھوڑی نجاست پر بھی زیادہ نجاست کا حکم لگاتے ہیں جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر کپڑے پر ایک درہم کے برابر نجاست ہو تو اس میں نماز ہو جائے گی۔ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن حسن کے موقف

میں امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ وسعت ہے وہ کہتے ہیں کپڑوں کا ایک چوتھائی حصّہ تک بھی اگر ناپاک ہو تو ان کپڑوں میں نماز ہو جائے گی۔ لہٰذا ایسا شخص امام محمد بن الحسن کے اختلافی قول کو اختیار کرے گا تاکہ اس کی نماز فوت ہونے سے بچ جائے یہ سہولت دیگر مسالک کے افراد کے لیے بلاشبہ نظریہ "مراعاۃ الخلاف" کی وجہ سے ہی میسّر آسکتی ہے۔

مثال نمبر۴ ایک اختلافی مسئلہ یہ ہے کہ کسی مردہ جانور کی کھال دباغت (رنگنے) سے پاک ہو جاتی ہے یا نہیں؟ ابنِ رشد اس ضمن میں فقہاء کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اختلفوا فی الانتفاع بجلود المیتة۔ فذهب قوم إلى الانتفاع بجلودها مطلقا دبغت أولم تدبغ۔ وذهب قوم إلى خلاف هذا۔ وهو ألا ينتفع به اصلا وإن دبغت۔ وذهب قوم إلى الفرق بين أن تدبغ وأن لاتدبغ۔ ورأوا أن الدباغ مطهر لها وهو مذهب الشافعی وابی حنيفة۔ وعن مالك روايتان: أحدهما مثل قول الشافعی والثانية أن الدباغ لايطهرها ولكن تستعمل فی اليابسات والذين ذهبوا إلى أن الدباغ مطهر اتفقوا على أنه مطهر لما تعمل فيه الذكاة من الحيوان، أعنی المباح الأكل[۵۳]"

مردہ جانوروں کی کھالوں سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے بعض کے نزدیک مردہ جانوروں کی کھالوں سے فائدہ حاصل کرنا درست ہے خواہ ان کی دباغت کی جائے یا نہ کی جائے۔ بعض اس کے خلاف ہیں ان کے نزدیک ایسی کھالوں سے فائدہ حاصل کرنا درست نہیں ہے خواہ ان کی دباغت ہی کیوں نہ کی جائے۔ بعض فقہاء نے مردہ جانوروں کی کھالوں کی دباغت کرنے اور نہ کرنے میں فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ دباغت سے مردہ جانوروں کی کھالیں پاک ہو جاتی ہیں یہ امام شافعی اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے امام مالک سے دو قول مروی ہیں۔ ایک قول تو امام شافعیؒ کے قول کی طرح ہے جبکہ دوسرا قول

یہ ہے کہ دباغت سے مردہ کھال پاک نہیں ہوتی۔ البتہ اسے خشک مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جو فقہاء دباغت سے مردہ کھال کے پاک ہو جانے کے قائل ہیں وہ اس بات پر متفق ہیں کہ صرف ان مردہ جانوروں کی کھال دباغت سے پاک ہوگی جو ذبح کیے جاسکتے ہوں یعنی جو جانور کھانے کے لیے حلال ہوں۔ (حرام جانوروں کی کھال رنگنے سے بھی پاک نہیں ہوگی بلکہ حرام ہی رہے گی)

حنفی فقہ کی ایک کتاب کا اقتباس ہے:

"یطھر جلدہ بالدباغ ونجس العین لایطھر جلدہ بالدباغ کالخنزیر کے"

دباغت سے مردہ جانور کی کھال پاک ہو جائے گی لیکن وہ جانور جو اصلاً نجس ہوں مثلاً خنزیر (سؤر) تو ان کی جلد دباغت سے بھی پاک نہیں ہوگی۔

آج کل جانوروں اور مویشیوں کے بڑے بڑے فارم قائم ہیں جہاں کاروباری بنیادوں پر ہزاروں کی تعداد میں جانور پالے جاتے ہیں اگر کسی فارم میں بیماری، وبا، یا کسی حادثہ وغیرہ کی وجہ سے مویشی ہلاک ہو جائیں تو فارم کے مالک کے لیے یہ بہت بڑا نقصان کی کسی حد تک تلافی نظریہ "مراعاۃ الخلاف" پر عمل کر کے کی جاسکتی ہے۔ مردہ جانوروں کی کھالوں کو دباغت کے بعد استعمال میں لایا جاسکتا ہے ورنہ مویشی بھی گئے، ان کی کھالیں بھی کسی کام نہ آسکیں اور فارم کا مالک بھی معاشی طور پر تباہ ہوگیا۔

اس مسئلہ میں فقہ حنفی کا دائرہ زیادہ وسیع ہے اس میں زیادہ سہولت پائی جاتی ہے جس کی رو سے ہر مردہ جانور کی کھال دباغت سے پاک ہو جائے گی ماسوائے ان جانوروں کے جو اصلاً نجس ہوں مثلاً سؤر وغیرہ فقہ حنفی کی اس وسعت سے وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جس نے شیر، چیتے اور ہاتھی وغیرہ پال رکھے ہوں جیسے کہ بعض مسلمان افریقی ممالک یا سری لنکا وغیرہ کے مسلمان تاجران جانوروں کی تجارتی مقاصد کے لیے فارمنگ کرتے ہیں۔ اب اگر ان جانوروں کے مرجانے سے ایسے مالک کو نقصان اٹھانا پڑ جاتا ہے جو مالی طور پر مستحکم نہیں ہے اور ایسے نقصان سے اسکی مالی ساکھ کو سخت دھچکا لگے گا تو وہ فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے ان جانوروں کی کھالوں کو دباغت

کر کے انہیں بیچ کر یا کسی اور طور سے استعمال میں لا کر اپنے نقصان میں کمی کر سکتا ہے۔

مثال نمبر ۵ ہر مسلمان دن میں پانچ مرتبہ فرض نمازیں ادا کرتا ہے۔ اس عبادت کی ادائیگی کے دوران ایسی صورتحال پیش آجاتی ہے کہ محض "مراعاۃ الخلاف" کی وجہ سے نماز خراب ہونے سے بچ جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص امام کے ساتھ رکوع کی حالت میں پہلی رکعت میں شامل ہوا اس نے رکوع کے لیے تکبیر کہی اور جماعت کے ساتھ مل گیا۔ وہ تکبیر اولی نہ پا سکا۔ اس صورت میں وہ فقہی اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امام کے ساتھ ہی نماز مکمل کرے گا۔ کیونکہ بعض کے نزدیک رکوع کی تکبیر کہنے سے تکبیر اولی بھی ہو جائے گی[6] لہذا وہ لوگ جو تکبیر اولی کو رکوع کی تکبیر سے الگ سمجھتے ہیں وہ اس کی نماز کو باطل قرار نہیں دے سکتے۔

الغرض ہماری عملی زندگی میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جن میں پائی جانے والی دشواری اور سختی کو نظریہ "مراعاۃ الخلاف" پر عمل کرنے سے دور کیا جا سکتا ہے اور سچ بات یہ ہے کہ ائمہ کرام کے فقہی اختلافات میں عوام کے لیے آسانی اور سہولت موجود ہے۔ ان ائمہ کرام کے تمام اجتہادات کا مقصد عوام کی پریشانیوں کو دور کرنا تھا ان کی زندگیوں کو مشکل بنانا نہیں تھا اور اور یہی دینِ اسلام کا مزاج ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سورۃ آل عمران۔ آیت : ۱۰۲

۲۔ سورۃ التغابن۔ آیت : ۱۶

۳۔ مسلم بن الحجاج۔ صحیح مسلم۔ کتاب الفضائل ۴/۴۳۔ احیاء التراث العربی بیروت ۱۹۷۲ م

۴۔ الشعرانی عبدالوہاب۔ کتاب المیزان۔ ۱/۳۔ المطبعۃ الازہریۃ مصر ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ م

۵۔ عبدالکریم زیدان، الدکتور۔ الوجیز فی اصول الفقہ ص ۲۹۳ مکتبہ القدس بغداد۔ ۱۴۰۵۔ ۱۹۸۵

۶۔ حوالہ بالا ص ۲۹۴

۷ ۔ البخاری، محمد بن اسماعیل ۔ صحیح بخاری ۔ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ۸۳۶/۲
مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور ۔
۸ ۔ الشعرانی عبدالوہاب ۔ کتاب المیزان ۔ ۳۸/۱
۹ ۔ ابن رشد، محمد بن احمد بن محمد بن احمد ۔ بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ۱۵/۱ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور
۱۰ ۔ سورۃ النساء ۔ آیت : ۴۳ اور سورۃ المائدہ ۔ آیت : ۶
۱۱ ۔ ابن رشد، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ۵۱/۱
۱۲ ۔ سورۃ الشوریٰ ۔ آیت : ۱۳
۱۳ ۔ محمد الخضری بک ۔ اصول الفقہ ۔ ص ۳۸۴ ۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر ۔ ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹م
۱۴ ۔ الشاطبی، ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ ۔ الموافقات فی اصول الشریعۃ ۔ ۱۴۲/۴
المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ بأول شارع محمد علی بمصر
۱۵ ۔ حوالہ بالا ۱۴۲/۴
۱۶ ۔ حوالہ بالا ۱۵۲/۴
۱۷ ۔ حوالہ بالا ۱۳۲/۴ ۔ ۱۳۳ ۔
۱۸ ۔ حوالہ بالا ۱۴۵/۴
۱۹ ۔ حوالہ بالا ۱۳۱/۴
۲۰ ۔ الآمدی، ابوالحسن علی بن ابو علی بن محمد ۔ الاحکام فی اصول الاحکام ۔ ۳۱۶/۴
دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰م
۲۱ ۔ الشاطبی ۔ الموافقات فی اصول الشریعۃ ۔ ۱۳۳/۴
۲۲ ۔ الآمدی ۔ الاحکام فی اصول الاحکام ۔ ۳۱۹/۴
۲۳ ۔ الشعرانی، عبدالوہاب ۔ کتاب المیزان ۔ ۳۷/۱
۲۴ ۔ الشاطبی ۔ الموافقات فی اصول الشریعۃ ۔ ۱۲۵/۴
۲۵ ۔ الدارمی، ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل بن بہرام ۔ سنن الدارمی ۱۵۱/۱
دار الکتب العلمیۃ ۔ بیروت
۲۶ ۔ حوالہ بالا ۱۵۱/۱
۲۷ ۔ الشعرانی عبدالوہاب ۔ کتاب المیزان ۔ ۲۴/۱

۲۸ ۔ الشاطبی ۔ الموافقات فی اصول الشریعۃ ۔ ۴/۱۵۲
۲۹ ۔ عبدالوہاب الشعرانی ۔ کتاب المیزان ۱/۳۶
۳۰ ۔ محمد الخضری بک ۔ اصول الفقہ ص۳۸۳
۳۱ ۔ الشعرانی عبدالوہاب ۔ کتاب المیزان ۔ ۱/۳۹
۳۲ ۔ الشاطبی ۔ الموافقات فی اصول الشعریۃ ۔ ۴/۱۲۵
۳۳ ۔ عبدالوہاب الشعرانی ۔ کتاب المیزان ۔ ۱/۲۵
۳۴ ۔ الفیروز آبادی ۔ ابواسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف التبصرۃ فی اصول الفقہ ص۴۱۵ ۔ دارالفکر
۳۵ ۔ الشعرانی عبدالوہاب ۔ کتاب المیزان ۔ ۱/۳۷
۳۶ ۔ الآمدی ۔ الاحکام فی اصول الاحکام ۔ ۴/۳۱۸
۳۷ ۔ حوالہ بالا ۴/۳۱۷
۳۸ ۔ الشعرانی، عبدالوہاب ۔ کتاب المیزان ۔ ۱/۱۴
۳۹ ۔ شاہ ولی اللہ ۔ اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ ۔ مترجم صدرالدین اصلاحی ص۱۵۴ ۔ اسلامک پبلی کیشنز لیمٹڈ لاہور ۱۹۸۰ء
۴۰ ۔ محمد زکریا البرديسي ۔ اصول الفقہ ۔ ص۴۷۷ دارالثقافۃ للنشر والتوزیع ۔ ۱۹۸۳م
۴۱ ۔ عبدالکریم الزیدان ، الدکتور ۔ الوجیز فی اصول الفقہ ص۴۱۲ ۔ مکتبۃ القدس بغداد ۱۹۸۵
۴۲ ۔ حوالہ بالا ص۴۱۱
۴۳ ۔ محمد الخضری بک ۔ اصول الفقہ ۔ ص۳۸۳
۴۴ ۔ عبدالوہاب الشعرانی ۔ کتاب المیزان ۱/۲۵
۴۵ ۔ البخاری ۔ صحیح بخاری ۔ کتاب الآداب ۳/۴۰۰
۴۶ ۔ حوالہ بالا ۔ کتاب الصوم ۱/۶۸۸
۴۷ ۔ سورۃ الحج ۔ آیت : ۷۸
۴۸ ۔ البخاری ۔ صحیح بخاری ۔ کتاب الایمان ۱/۱۰۰
۴۹ ۔ حوالہ بالا ۔ کتاب الآداب ۳/۳۹۹ ،
۵۰ ۔ اس حدیث کو عبدالوہاب الشعرانی نے "السنن الکبری للبیہقی" سے نقل کیا ہے کتاب المیزان ۱/۳۶
۵۱ ۔ سورۃ النحل ۔ آیت : ۴۳
۵۲ ۔ الغزالی، ابوحامد محمد بن محمد ۔ المستصفیٰ فی علم الاصول ۲/۳۸۷ ۔ منشورات الرضی ۔ قم